اسلام کا نظام تقسیم دولت

قسط ثانی

گذشتہ سے پیوستہ

اسلام کے نظریہ تقسیم دولت کے مذکورہ امتیازات میں سب سے بڑا اور بنیادی امتیاز یہ ہے کہ اس نے آجر اور سرمایہ کی تفریق ختم کر دی ہے جس کے نتیجے میں تقسیم دولت کے تین مد قرار پاتے ہیں۔ منافع، اجرت اور کرایہ چوتھے مد یعنی سود کو ناجائز قرار دے دیا گیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں "آجر" کی سب سے بڑی خصوصیت جسکی بنا پر اسے "منافع" کا مستحق قرار دیا گیا ہے، یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ کاروبار کے نفع ونقصان کا خطرہ برداشت کرتا ہے۔ گویا سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر سے "منافع" اسکی اس ہمت کا صلہ ہے۔ کہ اس نے ایک ایسی کاروباری مہم کا آغاز کیا جس میں اگر نقصان ہو جائے تو وہ تن تنہا اس پر پڑے گا۔ باقی تینوں عوامل پیداوار میں سے سرمایہ کو معین سود، زمین کو معین لگان اور محنت کو معین اُجرت مل جاتی ہے۔ اس لئے وہ نقصان سے بری ہیں۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ درحقیقت "نقصان کا خطرہ مول لینے" کی یہ صفت خود سرمایہ میں موجود ہونی چاہئے۔ اس خطرے کا بار کسی اور پر نہیں ڈالا جا سکتا۔ جو شخص کسی کاروبار میں اپنا سرمایہ لگانا چاہتا ہے اس کو یہ خطرہ مول لینا پڑے گا۔ اس لئے جو سرمایہ دار ہے وہی خطرہ مول لینے کے لحاظ سے آجر بھی ہے۔ اور جو شخص آجر ہے وہی سرمایہ دار بھی ہے۔

اب سرمایہ کے کسی کاروبار میں لگنے کی تین صورتیں ہیں :-

۱۔ انفرادی کاروبار | سرمایہ لگانے والا بلا شرکت غیرے خود ہی کاروبار بھی چلائے۔ اس صورت

میں اس کو جو صلہ ملے گا وہ خواہ عرفی اور قانونی اعتبار سے صرف "منافع" کہلاتے۔ لیکن معاشی اصطلاح کے مطابق وہ صلہ دو چیزوں کا مجموعہ ہوگا۔ سرمایہ لگانےکی وجہ سے "منافع" کا اور کاروبار چلانے کی محنت کے لحاظ سے اجرت کا۔

۲۔ شرکت | دوسری صورت یہ ہے کہ کئی آدمی مل کر سرمایہ لگائیں کاروبار چلانے میں بھی سب شریک ہوں اور نفع ونقصان میں بھی اسے فقہی اصطلاح میں "شرکت العقود" کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی معاشی اصطلاح کے مطابق تمام شرکا، سرمایہ لگانے کی حیثیت سے "منافع" کے حقدار ہوں گے اور کاروبار چلانے کی حیثیت سے "اجرت" کے۔ یہ صورت بھی اسلام نے جائز قرار دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل تجارت کا یہ طریقہ رائج تھا۔ آپ نے لوگوں کو اس پہ برقرار رکھا۔ اور اس کے جواز پہ اجماع منعقد ہوگیا[۱]۔

۳۔ مضاربت۔ | تیسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص سرمایہ لگائے۔ اور دوسرا کاروبار چلائے اور نفع میں دونوں شریک ہوں، اسے فقہی اصطلاح میں "مضاربت" کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں معاشی اصطلاح کے مطابق سرمایہ لگانے والے (رب المال) کو اس کا حصہ "نفع" کی صورت میں ملے گا اور کاروبار چلانے والے (مضارب) کو "اجرت" کی صورت میں۔ ہاں اگر کاروبار میں نقصان ہوجائے تو جسطرح رب المال کا سرمایہ بیکار گیا۔ اسی طرح مضارب کی محنت بیکار رہی۔
یہ صورت بھی اسلام میں جائز ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نکاح سے قبل یہی معاملہ فرمایا تھا[۲] اس کے بعد اس کے جواز پر بھی فقہا نے امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے[۳] ان تین صورتوں کے سوا کاروبار میں سرمایہ کے شریک ہونے کی اسلام میں کوئی اور صورت نہیں ہے۔

سود کا کاروبار | شغل سرمایہ کی چوتھی صورت جو غیر اسلامی معاشروں میں شروع سے رائج چلی آتی ہے، سود کا کاروبار ہے۔ یعنی ایک شخص سرمایہ بطور قرض دے، دوسرا محنت کرے، نقصان ہو تو محنت کا ہو اور سرمایہ کا سود ہر صورت میں کھرا رہے، اسکو اسلام نے حرام قرار

---

[۱] ملاحظہ ہو المبسوط للسرخسی ص ۱۵۱ ج ۱۱ مطبع السعادۃ مصر۔

[۲] زرقانی شرح المواہب ص ۱۹۸ ج ۱ الازہریہ مصر ۱۳۲۵ھ۔

[۳] المبسوط للسرخسی ص ۱۸ ج ۲۲

دیا ہے۔

یا ایھا الذین امنوا ذروا ما بقی	اے ایمان والو! سود میں سے جو کچھ باقی رہ گیا
من الربوا ان کنتم مومنین	ہو اسے چھوڑ دو، اگر تم مومن ہو، پس اگر تم ایسا
فان لم تفعلوا فأذنوا بحرب	نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے
من اللہ ورسولہ۔	اعلانِ جنگ سن لو۔

اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ:

فان تبتم فلکم رؤس اموالکم	پس اگر تم (سود سے) توبہ کرو تو تمہیں تمہارے
لاتَظلِمون ولاتُظلَمون۔	اصل اموال مل جائیں گے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو۔ نہ
	کوئی تم پر ظلم کرے۔

ان دو آیتوں میں "ما بقی من الربوا" اور "فلکم رؤس اموالکم" کے الفاظ نے پوری وضاحت کیساتھ یہ بات صاف کر دی ہے کہ سود کی ادنیٰ سے ادنیٰ مقدار کا باقی رہنا بھی اللہ کو گوارا نہیں ہے اور سود کو چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ قرض دینے والے کو صرف "راس المال" واپس ملے، لہذا اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ اسلام کی نظر میں صفر کے سوا سود کی ہر شرح نامعقول ہے۔

جاہلیت میں بعض قبائل عرب دوسرے قبیلوں سے سود پر قرض لے کر کاروبار کرتے تھے۔ اسلام نے ان تمام معاملات کو یکسر موقوف کر دیا۔ ابن جریج فرماتے ہیں:

کانت بنو عمرو بن عمر بن عوف یاخذون	جاہلیت میں بنو عمرو بن بنو المغیرہ سے سود لیا کرتے
الربا من بنی المغیرۃ وکانت بنو المغیرۃ یربون	تھے۔ اور بنو المغیرہ انہیں سود دیتے تھے جب
لھم فی الجاھلیۃ فجاء الاسلام ولھم علیھم	اسلام آیا تو ان کا ان پر بہت سارا مال واجب
مال کثیر۔	تھا۔

اور

کان بنو المغیرۃ یربون لثقیف [1]	بنو مغیرہ بنو ثقیف کو سود دیا کرتے تھے۔

واضح رہے کہ قبائل عرب کی حیثیت مشترکہ کمپنیوں کی سی تھی جو افراد کے مشترکہ سرمایہ سے کاروبار کرتی تھیں۔ اس لئے ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے کا اجتماعی طور پر قرض لینا عموماً کاروبار کے لئے ہوتا تھا۔ اور اسکو بھی قرآن کریم نے ممنوع قرار دے دیا۔

---

[1] تفسیر الدر المنثور بحوالہ ابن جریر ص ۳۳۶ ج اوّل۔

غرض اسلامی نظامِ معیشت میں جو شخص کسی کاروباری آدمی کو اپنا روپیہ کاروبار میں لگانے کے لئے دینا چاہتا ہے اسے پہلے یہ متعین کرنا پڑے گا کہ وہ روپیہ کاروبار کے نفع میں خود حصہ دار ہونے کے لئے دے رہا ہے۔ یا وہ اس روپیہ سے اس کاروباری آدمی کی امداد کرنا چاہتا ہے۔ اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ روپیہ دیکر کاروبار کے نفع سے مستفید ہو تو اسے "شرکت" یا "مضاربت" کے طریقوں پر عمل کرنا پڑے گا۔ یعنی اسے کاروبار کے نفع ونقصان کی ذمہ داری بھی اٹھانی پڑے گی۔ کاروبار کو نفع ہوا تو وہ نفع میں شریک ہوگا۔ اور اگر کاروبار کو خسارہ ہوا تو اسے خسارے میں بھی حصہ دار ہونا پڑے گا۔

اور اگر وہ روپیہ دوسرے کی امداد کی غرض سے دے رہا ہے تو پھر ضروری ہے کہ وہ اس امداد کو امداد ہی سمجھے۔ اور "نفع" کے ہر مطالبے سے دستبردار ہو جائے، وہ صرف اتنے ہی روپے کی واپسی کا مستحق ہوگا جتنے اس نے قرض دیئے تھے۔ اسلام کی نظر میں اس ناانصافی کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ وہ اپنے "سود" کی ایک شرح معین کرکے نقصان کا سارا بوجھ مقروض پر ڈال دے۔

اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ اسلام میں "نقصان کا خطرہ مول لینے" کی ذمہ داری "سرمایہ" پر ہے۔ جو شخص کاروبار میں سرمایہ لگائیگا اسے یہ خطرہ ضرور مول لینا پڑے گا[1] لہٰذا اگر "آجر" کی بنیادی خصوصیت یہ ہے (جیسا کہ بیشتر ماہرین معاشیات کا خیال ہے) کہ وہ "خطرہ مول لیتا ہے" تو یہ خصوصیت اسلام کی نظر میں درحقیقت "سرمایہ" کی ہے۔ اس لئے اسلامی نظام معیشت میں سرمایہ اور آجر ایک ہی چیز ہو جاتے ہیں اور تقسیم دولت میں ان کا حصہ منافع ہے، نہ کہ سود۔

اور اگر "آجر" کی بنیادی خصوصیت یہ سمجھی جائے کہ وہ تنظیم اور منصوبہ بندی کرتا ہے (جیسا کہ بعض ماہرین معاشیات کا خیال ہے۔) تو پھر یہ کام "محنت" میں داخل ہے۔ اور اسے الگ عامل پیداوار سمجھنا طول لاطائل ہے۔

کرایہ اور سود کا فرق | مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اسلام کی رو سے منافع اور اجرت جائز ہے۔ اور سود ناجائز۔ اب چوتھی چیز "کرایہ" رہ جاتی ہے۔ اسلام نے اسے

---

[1] اگر کسی شخص نے قرض حسن لیکر کاروبار میں سرمایہ لگایا ہے اور دائن کیساتھ شرکت یا مضاربت کا معاملہ نہیں کیا تو قرض لینے کے بعد مدیون خود اس روپے کا مالک ہوگیا اب وہ خود سرمایہ دار کی حیثیت سے روپیہ لگا رہا ہے۔ اس لئے نقصان کی ذمہ داری بھی اس پر ہوگی۔

بھی جائز قرار دیا ہے۔ بعض حضرات کو یہاں یہ اشکال ہونے لگتا ہے کہ جب سرمایہ پر سود کا لین دین معین ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے تو زمین کا کرایہ (واضح رہے کہ ہماری اصطلاح میں زمین کے اندر مشینری وغیرہ بھی داخل ہے) کیوں جائز ہے جبکہ وہ بھی معین ہوتا ہے۔

اس سوال کے جواب کیلئے پہلے یہ سمجھنا چاہیئے کہ معیشت کے مادی وسائل دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جنہیں استعمال کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے انہیں خرچ کرنا نہیں پڑتا، بلکہ وہ اپنا وجود برقرار رکھتے ہوئے فائدہ دیتے ہیں۔ مثلاً زمین، مشینری، فرنیچر، سواری وغیرہ کہ ان کے وجود کو باقی رکھتے ہوتے ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ ان سے مستفید ہونے کے لئے انہیں خرچ یا فنا کرنا نہیں پڑتا۔ ایسی چیزیں چونکہ بذات خود قابل استفادہ ہوتی ہیں۔ اور ان کے بہت سے فوائد وہ ہیں جنہیں حاصل کرنے کے لئے کرایہ پر لینے والے کو ذرہ برابر محنت نہیں کرنی پڑتی۔ دوسری طرف ان کے استعمال سے ان کی قدر گھٹتی ہے۔ اس لئے ان کے منافع کی اُجرت کا لین دین بالکل معقول اور درست ہے۔ اور اس "منافع" کی اُجرت کا لین دین بالکل معقول اور درست ہے۔ اور اس "منافع" کی اُجرت کو اسلام "کرایہ" کہتا ہے۔

اس کے برخلاف نقد روپیہ وہ چیز ہے جس سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے اسے خرچ یا فنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سے کسی قسم کا فائدہ اس وقت نہیں اٹھایا جا سکتا جب تک کہ اس سے کوئی چیز خریدی نہ جائے۔ لہٰذا روپیہ چونکہ بذات خود قابل استفادہ نہیں ہوتا۔ اس لئے ایک طرف اس سے جس قسم کا فائدہ بھی مقروض اٹھانا چاہئے اسے خرچ کر کے خود کچھ عمل کرنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف مقروض کے استعمال کی وجہ سے روپیہ کی قدر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس لئے اس پر کوئی معین "شرح سود" مقرر کرنے میں کوئی معقولیت نہیں ہے۔ روپیہ کے مالک کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو قرض نہ دے۔ یا چاہے تو اس کے ذریعہ روپے کے حاجتمند کے ساتھ شرکت و مضاربت کا کاروبار کرے۔ لیکن اگر وہ قرض دیتا ہے تو اس پر معین "شرح" سے سود لینے کی اسلام اجازت نہیں دے سکتا۔

اسی بناء پر ہم نے یہ اصطلاح مقرر کی ہے کہ جو چیزیں بذات خود خرچ کئے بغیر قابل استفادہ نہیں ہوتیں وہ "سرمایہ" کہلائیں گی اور جب وہ عامل پیداوار کی حیثیت سے کاروبار میں شریک ہوں گی تو "منافع" کی مستحق ہوں گی اور جو چیزیں خرچ کئے بغیر قابل استفادہ ہوتی ہیں وہ "زمین" کہلائیں

گی اور عمل پیدائش میں حصہ دار ہونے کی وجہ سے انہیں "کرایہ" کی صورت میں دولت تقسیم کی جائیگی۔

حرمت سود کا اثر تقسیم دولت پر۔ مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ اسلام اور سرمایہ داری کے نظام تقسیم دولت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشیات میں "سود" جائز ہے اور اسلام میں ناجائز۔ اب مختصراً اس پہلو پر نظر ڈال لینا بھی مناسب ہوگا کہ حرمت سود کے معاشی اثرات کیا ہیں۔

یوں تو "سود" کی حرمت سے "پیدائش دولت" کے نظام پر بھی بڑے گہرے دور رس اور مفید اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس لئے یہاں اس کے صرف ان اثرات کی طرف مجمل اشارے عرض کئے جاتے ہیں جو "تقسیم دولت" کے نظام پر مرتب ہوتے ہیں۔ حرمت سود کا ایک سادہ اثر تو یہ ہے کہ اسکی وجہ سے تقسیم دولت کے نظام میں توازن اور ہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ سودی نظام معاشیات کا یہ خاصہ لازمہ ہے کہ اس میں ایک فریق (سرمایہ) کا نفع تو متعین صورت میں بہر حال کھرا رہتا ہے۔ لیکن اس کے مقابل دوسرے فریق (محنت) کا نفع مشتبہ اور موہوم رہتا ہے۔ وسیع پیمانے کی تجارتیں خواہ کتنی ہی نفع بخش کیوں نہ ہو جائیں۔ لیکن انہیں بہر حال "خطرے" سے خالی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ جہاں موجودہ وسائل معیشت کی فراوانی سے بڑے پیمانے کی تجارتوں کے خطرات کم ہوئے ہیں، وہاں کچھ خارجی عوامل کی بنا پر ان میں اضافہ بھی ہوا ہے۔ اور تجارت جتنے بڑے پیمانے کی ہوتی ہے۔ یہ خطرات بھی اتنے ہی شدید ہو جاتے ہیں۔ اس لئے سرمایہ دارانہ معیشت میں تقسیم دولت کا توازن نہایت ناہموار ہو جاتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قرض لینے والے کو سخت نقصان اٹھانا پڑا لیکن قرض دینے والے کی تجوری بھرتی ہی چلی گئی، اور کبھی اس کے برعکس یہ ہوتا ہے کہ آجر کو بے انتہا منافع ہوا اور سرمایہ دینے والے کو اس میں سے بہت معمولی سا حصہ مل سکا۔

اس کے برخلاف اسلامی نظام میں چونکہ سود حرام ہے اس لئے موجودہ دنیا میں عموماً شغل سرمایہ کی صرف دو صورتیں ہوں گی۔ شرکت اور مضاربت۔ اور یہ دونوں صورتیں تقسیم دولت کی اس غیر منصفانہ ناہمواری سے خالی ہیں۔ ان صورتوں میں نقصان ہوتا ہے۔ تو فریقین کو ہوتا ہے۔ اور نفع ہوتا ہے تو دونوں فریق متناسب طریقے سے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ "ارتکاز دولت" جو سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بدترین خرابی ہے۔ اس طریقے کی بدولت اسکی بڑی حد تک مؤثر روک تھام ہو جاتی ہے۔ اور دولت کا ذخیرہ چند ہاتھوں میں سمٹنے کی بجائے معاشرے کے افراد

میں اسطرح پھیلتا ہے کہ اس سے کسی شخص پر کوئی ظلم نہیں ہو پاتا۔ وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں ارتکازِ دولت کی ایک بہت بڑی وجہ "سود" ہے۔ اس کی وجہ سے مٹھی بھر سرمایہ دار نہ صرف یہ کہ دولت کے بڑے خزانے پر قابض ہو جاتے ہیں، بلکہ وہ پورے بازار پر بھی پوری خود غرضی کے ساتھ حکمرانی کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں "رسد اشیاء" اور قیمتوں" کا نظام بھی قدرتی رہنے کی بجائے مصنوعی ہو جاتا ہے۔ اور معیشت و اخلاق سے لیکر ملکی سیاست تک زندگی کا کوئی گوشہ اس کے برے اثرات سے محفوظ نہیں رہتا۔

اسلام نے "سود" کو ممنوع قرار دے کر ان تمام خرابیوں کی بنیاد کو منہدم کر دیا ہے اسلامی نظام میں ہر روپیہ لگانے والا کاروبار اور اسکی پالیسی میں شریک ہوتا ہے۔ نفع و نقصان کی ذمہ داریاں بھی اٹھاتا ہے۔ اور اسطرح اسکی کاروباری مرض بے لگام نہیں ہونے پاتی۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ یہاں ایک شبہ کا ازالہ کر دینا مناسب ہوگا۔ "سود" کے بارے میں جو یہ کہا گیا ہے کہ اسکی وجہ سے تقسیم دولت میں ناہمواری پیدا ہوتی ہے اور فریقین میں سے کوئی نہ کوئی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ اس پر بعض حضرات کے دل میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ سودی کاروبار میں جس شخص کو بھی نقصان پہنچتا ہے وہ اسکی مرضی سے پہنچتا ہے۔ اور جب وہ خود یہ خطرہ مول لینے پر راضی ہے تو اس میں قانون شریعت کیوں دخل انداز ہوتا ہے۔

حالانکہ ذرا سا غور کیا جائے تو اس کا جواب سمجھنا کوئی مشکل نہیں۔ اسلامی نظام زندگی کا معمولی سا مطالعہ بھی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اسلام میں فریقین کی باہمی رضامندی ہمیشہ کسی معاملے کی وجہ جواز نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو جانے پر راضی ہو تو یہ بات قاتل کو بری نہیں کر سکتی۔ یہاں تک کہ "زنا" جسے مغربی تہذیب کی تنگ نظری نے خالص نجی زندگی کا مسئلہ سمجھا ہوا ہے۔ اس میں بھی فریقین کی رضامندی مجرموں کو بری نہیں کر سکتی۔

دولت کی تقسیم اور معاشی نظام کی بہبود کا معاملہ تو اس سے کچھ آگے ہی ہے۔ شروع میں قرآن کریم کے حوالوں سے عرض کیا جا چکا ہے کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے اور اس نے انسان کو جو ملکیت عطا کی ہے وہ آزاد اور بے لگام ہونے کی بجائے اصولوں کی پابند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ معاملہ جو اسلام کی نظر میں فی نفسہ غیر منصفانہ ہے۔ یا جس کا اثر معاشرے کی اجتماعی بہتری پر پڑ سکتا ہے۔ اس میں اسلام نے فریقین کی رضامندی کو وجہ جواز قرار نہیں دیا۔ احادیث میں فریقین کی رضامندی کے باوجود جو "تلقی الجلب، بیع الحاضر للباد، محاقلہ، مزابنہ اور

مخابرہ ــــــ وغیرہ کی شدید ممانعت آتی ہے اس کے پیچھے بھی حکمت کارفرما ہے۔ اس لئے "سود" کے معاملے کو بھی محض اس بنا پر جائز قرار نہیں دیا جا سکتا کہ فریقین اس پر رضامند ہیں۔

جاہلیت کے لوگ حرمت سود پر اسی قسم کا اعتراض کیا کرتے تھے کہ:

انما البیع مثل الربوا۔ بیع بھی ربا ہی کی طرح تو ہے۔

قرآن کریم نے مختصر لفظوں میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ:

واحل اللہ البیع وحرم الربوا۔ اور اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام۔

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعتراض کے جواب میں "حرمت سود" کی کوئی حکمت اور مصلحت نہیں بیان فرمائی، بلکہ صرف یہ فرمایا ہے کہ جب اللہ نے بیع کو حلال اور ربوا کو حرام کر دیا ہے۔ تو خواہ اسکی مصلحت تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اس حکم کو ماننا پڑے گا۔ یہاں قرآن کریم نے حکمتوں کو بیان فرمانے کی بجائے حاکمانہ اسلوب اختیار فرمایا ہے۔ جس سے حرمت سود پر ہر قسم کے اعتراض کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سود کی حرمت اسلام کا وہ حکیمانہ فیصلہ ہے جسکی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بہت سی خرابیاں بھی دور ہو جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد اشتراکیت کے مستبد اور غیر فطری نظام معیشت کو اختیار کرنے کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہی وہ اعتدال کی راہ ہے، جو موجودہ دنیا کو افراط و تفریط سے نجات دلا کر ایک متوازن اور منصفانہ نظام معیشت کی طرف رہنمائی کر سکتی ہے۔ فرانسیسی پروفیسر لوئی ماسین تون نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ:

"سرمایہ داری اور اشتراکیت کے تصادم میں اسی تمدن اور تہذیب کا مستقبل محفوظ اور درخشاں رہے گا جو سود کو ناجائز قرار دیکر اس پر عمل بھی کر رہا ہو[۱]"

اجرتوں کا مسئلہ | یہاں تک تقسیم دولت کے معاملے میں اسلام اور سرمایہ داری کا ایک بنیادی فرق واضح ہوا ہے اور وہ ہے مسئلہ سود۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان ایک اور فرق کو ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے جو آجر اور اجیر کے رشتے سے متعلق ہے اور جس میں اجرتوں کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے۔

---

[۱] ڈاکٹر یوسف الدین۔ اسلام کے معاشی نظریئے ص ۲۸۰ ج ۲ بحوالہ ڈاکٹر حمید اللہ انجمن ہائے قرضہ حسنہ کی اہمیت مجلہ طیلسانیین عثمانیہ ج ۷ حصہ معاشیات ج ۲ ۱۹۴۳ء

سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف موجودہ دنیا میں جو شدید ردعمل ہوا ہے اسکی بہت بڑی وجہ آجر اور اجیر کے جھگڑے اور اجرتوں کی تعیین کے مسائل تھے۔ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بنیاد ہی چونکہ خود غرضی اور بے لگام انفرادی ملکیت پر ہے۔ اس لیے اس نظام میں آجر اور اجیر کے درمیان "رسد و طلب" کا ایک ایسا خشک، کھردرا اور رسمی تعلق ہے جسکی بنیاد خالص خود غرضی پر استوار ہوئی ہے۔ آجر صرف اس حد تک اجیر کی انسانیت کا احترام کرتا ہے جب تک وہ اپنے کاروبار کے لئے اس کے ہاتھوں مجبور رہے۔ لہذا جہاں یہ مجبوری ختم ہو جاتی ہے وہاں وہ اس پر اپنے ظلم کا شکنجہ کس دیتا ہے۔ دوسری طرف اجیر صرف اس وقت تک آجر کے کام اور اس کے احکام سے دلچسپی رکھتا ہے۔ جب تک اس کا روزگار کسی آجر پر موقوف ہو۔ لہذا جہاں اسکی یہ مجبوری ختم ہو جاتی ہے وہاں وہ کام چوری اور ہڑتال سے نہیں چوکتا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مزدور اور سرمایہ دار میں ایک ہی کشمکش قائم رہتی ہے۔ اور دونوں کے درمیان کوئی صحت مند رابطہ قائم نہیں ہو پاتا۔

اس کے برخلاف اسلام نے اگرچہ آجر اور اجیر کے درمیان رسد اور طلب کے نظام کو ایک حد تک تسلیم کیا ہے، لیکن ساتھ ہی محنت کی رسد اور طلب دونوں پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ ان کا باہمی رابطہ ایک خشک رسمی تعلق نہیں رہا۔ بلکہ بڑی حد تک بھائی چارہ بن گیا ہے۔ آجر کا نقطۂ نظر اجیر کے بارے میں کیا ہونا چاہئے، اسکو قرآن کریم نے حضرت شعیب علیہ السلام کا ایک مقولہ نقل فرماتے ہوئے مختصر لفظوں میں واضح فرما دیا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے "آجر" تھے۔ انہوں نے فرمایا:

وما ارید ان اشق علیک ستجدنی	میں تم پر (غیر ضروری) مشقت ڈالنا نہیں
انشاء اللہ من الصالحین۔	چاہتا۔ خدا نے چاہا تو تم مجھے نیکوکار پاؤ گے۔

اس آیت نے واضح فرما دیا کہ ایک مسلمان آجر جس کی اصلی منزل مقصود "صالح" ہونا ہے، اس وقت تک "صالح" نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے اجیر کو غیر ضروری مشقت سے بچانے کا داعیہ نہ رکھتا ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو مزید واضح الفاظ میں اسطرح کھول دیا ہے کہ

ان اخوانکم خولکم جعلھم اللہ	تمہارے بھائی تمہارے خادم ہیں، جنہیں اللہ نے
تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت	تمہارے زیر دست کیا ہے۔ لہذا جس شخص کا
یدہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ	بھائی اس کا ماتحت ہو اسے چاہیئے کہ وہ جو

مما یلبس ولا تکلفوھم ما یغلبھم فان کلفتموھم ما یغلبھم فأعینوھم۔ [1]	خود کھائے اس میں سے اسکو بھی کھلائے، اور جو خود پہنے اس میں سے اسکو بھی پہنائے اور ان پر کسی ایسے کام کا بوجھ نہ ڈالو جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو۔ اور اگر کسی ایسے کام کا بوجھ ڈالو تو خود ان کی مدد کرو۔

نیز ارشاد فرمایا کہ:

اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ۔ [2]	مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو۔

اسی طرح آپ کا ارشاد ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن کا میں قیامت کے دن دشمن ہوں گا، ان میں سے ایک وہ ہے کہ:

رجل استاجر اجیرًا فاستوفیٰ منہ ولم یعطہ اجرہ [3]	وہ شخص جو کسی مزدور کو اجرت پر لے۔ پھر اس سے کام پورا لیلے اور اسکو اسکی اجرت نہ دے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مزدوروں کے حقوق کا کس قدر احساس تھا۔ اس کا اندازہ حضرت علیؓ کی ایک روایت سے ہوتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ وفات سے قبل آپؐ کے آخری الفاظ یہ تھے:

الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم۔ [4]	نماز کا خیال رکھو اور ان لوگوں (کے حقوق) کا جو تمہارے زیر دست ہیں۔

ان ہدایات کے نتیجے میں "مزدور" کو اسلامی معاشرے میں جو باوقار اور برادرانہ مقام حاصل ہوا اسکی بیشمار مثالیں قرون اولیٰ کی اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں۔ اور پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ "مزدور" کے حقوق کی رعایت اس سے بہتر طریقے پر ممکن ہی نہیں ہے۔

دوسری طرف اسلام نے "آجر" کو بھی کچھ احکام کا پابند بنا کر آجر سے اس کے تعلقات

---

[1] صحیح بخاری کتاب العتق ص ۳۴۶ ج اول۔

[2] ابن ماجہ وطبرانی عن ابن عمر (جمع الفوائد ص ۲۵۶ ج اول میرٹھ ۱۳۴۵ھ۔

[3] صحیح بخاری کتاب الاجارہ بروایت ابوہریرہ ص ۳۰۲ ج اول۔

[4] ابن ماجہ (جمع الفوائد ص ۲۶۴ ج اول)

کو مزید خوشگوار کر دیا ہے۔ مزدور آجر کے جس کام کی ذمہ داری اٹھاتا ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے وہ ایک ایسا معاہدہ کرتا ہے جسکی پابندی اسے صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لئے نہیں کرنی ہے بلکہ اسکی اصل منزل مقصود یعنی آخرت کی بہتری بھی اس پر موقوف ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

یا ایہا الذین آمنوا اوفوا بالعقود۔	اے ایمان والو تم اپنے معاہدوں کو پورا کرو۔

اور ارشاد ہے:

ان خیر من استاجرت القوی الامین۔	بہترین اجیر وہ ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی۔

نیز ارشاد ہے:

ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون۔ ...	دردناک عذاب ہے ان ناپ تول میں کمی کرنیوالوں کیلئے جو اپنا حق لینے کے وقت پورا پورا وصول کریں اور جب انہیں ناپ یا تول کر دینے کا موقعہ آئے تو کمی کر جائیں

فقہائے امت کی تصریحات کے مطابق اس آیت میں "مطففین" یا ناپ تول میں کمی کرنیوالے کے مفہوم میں وہ مزدور بھی داخل ہے جو طے شدہ اجرت پوری وصول کرنے کے باوجود کام چوری کا مرتکب ہو۔ اور اپنے جو اوقات اس نے آجر کو بیچ دئے ہیں انہیں آجر کی مرضی کے خلاف کسی اور کام میں صرف کرے۔ اس لئے ان احکام نے "کام چوری" کو گناہ عظیم قرار دے کر اجیر کو بھی یہ جتلا دیا ہے کہ جس آجر کا کام کرنا اس نے قبول کیا ہے، اسکی ذمہ داری اٹھا لینے کے بعد اب وہ خود اس کا اپنا کام بن گیا ہے۔ اور اس کے ذمے ضروری ہے کہ وہ پوری دیانتداری، مستعدی اور لگن کے ساتھ اسے انجام دے، ورنہ وہ آخرت کی اس بہتری کو حاصل نہ کر سکے گا جو اس کا اصل منتہائے مقصود ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے اجرتوں کے مسئلے میں رسد و طلب کے نظام کو ایک حد تک تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ آجر اور اجیر دونوں کیلئے کچھ ایسے احکام دیدئے ہیں کہ ان کی وجہ سے رسد و طلب کا یہ نظام خود غرضی کی بجائے اخوت و ہمدردی پر مبنی ہو گیا ہے۔

ہو سکتا ہے یہاں کسی صاحب کو یہ شبہ پیدا ہو کہ آجر اور اجیر دونوں پر پابندیاں عائد کرنے

کے لئے قرآن و سنت نے جو احکام دئیے ہیں انکی حیثیت اخلاقی ہدایات کی سی ہے۔ جو ٹھیٹھ معاشی اور قانونی نقطۂ نظر سے خارج از بحث ہیں۔ لیکن یہ اعتراض اسلام کے مزاج کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہوگا۔ یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اسلام محض ایک معاشی نظام ہی نہیں ہے، بلکہ وہ زندگی کا ایک مکمل دستور العمل ہے جس میں زندگی کے تمام شعبے باہم مربوط رہ کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں ان میں سے کسی ایک شعبے کو دوسرے تمام شعبوں سے کاٹ کر سمجھنے کی کوشش لازماً غلط فہمیاں پیدا کرے گی۔ اس کے ہر شعبے کا صحیح اس وقت سامنے آسکتا ہے۔ جب اسے اس کے مجموعی نظام زندگی میں فٹ کر کے دیکھا جائے۔ اس لئے اسلامی معاشیات کی بحث میں ان اخلاقی ہدایات کو خارج از بحث قرار نہیں دیا جاسکتا۔

پھر اسلام کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اگر ذرا وسیع نظر سے دیکھا جائے تو اسکی اخلاقی ہدایات بھی درحقیقت قانونی احکام ہیں اس لئے کہ ان پر بالآخر آخرت کی جزا و سزا مرتب ہوتی ہے جسکو ایک مسلمان کی زندگی میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ "عقیدہ آخرت" ہی وہ چیز ہے جس نے نہ صرف یہ کہ اخلاق کو قانون کا درجہ عطا کیا ہے، بلکہ اصطلاحی قوانین کی پشت پناہی بھی کی ہے۔۔۔ قرآن کریم کے اسلوب پر اگر آپ غور فرمائیں تو نظر آئے گا کہ اس کے ہر قانونی اور اخلاقی حکم کیساتھ "خوف خدا" اور "فکر آخرت" کے مضامین لگے ہوتے ہیں۔ اس میں اصلی راز یہی ہے کہ درحقیقت قانون کی پابندی محض انسانی ڈنڈے کے زور سے کبھی نہیں کرائی جاسکتی، تاوقتیکہ انسان کی ہر نقل و حرکت اور ہر فکر و عمل پر پہرہ دینے کیلئے "فکر آخرت" موجود نہ ہو، یوں تو دنیا کی ہزار سالہ طویل تاریخ جو پوری قانونی جکڑ بندیوں کے باوجود مظالم اور جرائم کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس ناقابلِ انکار حقیقت کی تصدیق کرتی ہے۔ لیکن خاص طور سے آج کی مہذب دنیا نے تو اسے روز روشن کی طرح عیاں کر دیا ہے۔ کہ جس رفتار سے قانونی مشنریوں میں اضافہ ہو رہا ہے اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے جرائم بڑھ رہے ہیں۔

اس لئے یہ سمجھنا کہ "اجیر" اور "آجر" کے تعلقات محض قانونی جکڑ بندیوں سے درست ہوسکیں گے انتہا درجے کی خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔ اس کا اصلی علاج صرف اور صرف "فکر آخرت" ہے اور اسلام نے اس معاملے میں اس پر زیادہ زور دیا ہے۔

آج کا ذہن جو محض دنیوی زندگی کے الٹ پھیر میں الجھ کر مادے کے اس پار جھانکنے کی صلاحیت کھو چکا ہے۔ اس کے لئے شاید اس بات کو سمجھنا مشکل ہو لیکن یقین ہے کہ اگر امن و

سکونِ انسانیت کے لئے مقدر ہے تو وہ سینکڑوں ٹھوکریں کھاکر بالآخر اس حقیقت تک پہنچے گی جس کی طرف قرآنِ کریم نے بار بار توجہ دلائی ہے۔ جس زمانے میں اسلام ایک عملی نظام کی حیثیت سے اس دنیا میں کارفرما تھا۔ اس وقت دنیا اس قرآنی نظریئے کی صداقت کو خوب اچھی طرح دیکھ چکی ہے۔ اس دور کی تاریخ میں "آجر اور اجیر" کے جھگڑوں کی یہ کیفیت ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی جس نے کچھ عرصہ سے پوری دنیا کو تہ و بالا کیا ہوا ہے۔ قرآن و سنت کی یہی وہ اخلاقی ہدایات تھیں جنہوں نے اس مسئلے کا اطمینان بخش حل پیش کرکے دکھایا اور جنکی وجہ سے اسلام کے قرونِ اولیٰ کی تاریخ آجر کے جبر و تشدد اور اجیر کی ہڑتالوں سے تقریباً خالی نظر آتی ہے۔

تقسیم دولت کے ثانوی مدات

اب تک ہماری بحث تقسیم دولت کے اولین حقداروں سے متعلق تھی۔ اسلامی نظریۂ تقسیم دولت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے عاملین پیداوار کے ساتھ دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست دی ہے اور اس کا ایک باقاعدہ نظام بنایا ہے۔

مقالے کی تمہید میں اس بات کی طرف اشارے کئے جا چکے ہیں۔ کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے۔ وہی اس کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور اس نے انسان کو اس پر ملکیت کے حقوق عطا کئے ہیں۔ انسان کو اس کے کسب و عمل کا جبھی صلہ ملتا ہے۔ وہ اس کا مالک ضرور ہے۔ لیکن چونکہ کسب و عمل کی تمام تر توفیق اللہ ہی دیتا ہے۔ اور دولت کی تخلیق بھی اسی نے کی ہے۔ اس لئے انسان اپنی ملکیت کے استعمال میں قطعی طور پر خود مختار نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کے احکام کا پابند ہے۔ لہٰذا جس جگہ خرچ کرنے کا وہ حکم دیدے انسان کیلئے وہاں خرچ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اسی بنیادی نظریئے سے عمل پیدائش کے علاوہ استحقاق دولت کا ایک دوسرا مد خودبخود نکل آتا ہے۔ یعنی ہر وہ شخص اسلامی نقطۂ نظر سے دولت کا مستحق ہے۔ جس تک دولت کا پہنچانا اللہ نے دولت کے اولین مالکوں کے ذمے فرض قرار دیا ہے۔ اس طرح تقسیم دولت کے ثانوی مدات کی ایک طویل فہرست مرتب ہو جاتی ہے، جن میں سے ہر ایک دولت کا مستحق ہے۔

ان مدات کو مقرر کرکے اسلام درحقیقت یہ چاہتا ہے کہ دولت کو معاشرے میں

زیادہ سے زیادہ گردش دی جائے اور ارتکازِ دولت پر جو پابندیاں "سود" کی حرمت کے ذریعہ عائد کی گئی ہیں ان میں مزید توسیع دی جائے۔ ان مدات کا تفصیلی بیان تو اس مختصر مقالے میں ممکن نہیں ہے۔ تاہم انہیں اختصار کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے۔

۱۔ زکوٰۃ | ان میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ وسیع مد " زکوٰۃ " ہے۔ قرآن کریم نے بیشمار مقامات پر اس فریضے کو " نماز " کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ہر وہ شخص جو سونے چاندی مویشی اور مالِ تجارت کا مقدار نصاب کی حد تک مالک ہو۔ اس کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ کہ وہ سال گذرنے پر اپنی ان مملوکات کا ایک حصّہ دوسرے ضرورت مند افراد پر صرف کرے۔ اور جو شخص اس فریضے کو ادا نہ کرے اس کے لئے قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ :

الذین یکنزون الذھب والفضۃ	جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کر رکھتے ہیں۔
ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم	اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انکو
بعذاب الیم۔ یوم یحمیٰ علیھا فی نار جھنم	آپ دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔ جس
فتکوی بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم	دن اس (دولت) کو جہنم کی آگ میں گرم کیا
ھذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا	جائے گا۔ پھر اس سے انکی پیشانیوں اور پہلوؤں
ما کنتم تکنزون۔	اور پشتوں کو داغا جائے گا۔ یہ وہ مال ہے جو
	تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔ چکھو جسے تم
.....	جمع کیا کرتے تھے۔
.....	

——— پھر اس زکوٰۃ کی ادائیگی کیلئے قرآنِ کریم نے آٹھ مصارف خود مقرر فرما دئے ہیں ———
اسی طرح " زکوٰۃ " کے اس ایک مد کیلئے آٹھ مصارف مقرر فرما کر قرآنِ کریم نے دولت کی زیادہ سے زیادہ گردش کا دروازہ کھول دیا ہے۔

" زکوٰۃ " کے مصارف میں استحقاق کی قدر مشترک " ناداری " اور " افلاس " ہے اور اس مد میں افلاس ہی کے خاتمے پر زور دیا گیا ہے۔ اس طریقے سے نادار اور مفلس افراد کے درمیان کس قدر وسیع پیمانے پر تقسیم دولت ممکن ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں پاکستان کی قومی آمدنی تقریباً پندرہ ارب تیس کروڑ روپیہ تھی۔ زکوٰۃ کی ادنیٰ ترین شرح یعنی ۲٫۵ فی صد کے حساب سے اگر قومی آمدنی کی پوری زکوٰۃ نکالی جائے تو کم از کم اڑتیس کروڑ پچیس لاکھ روپیہ سالانہ صرف غریبوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر تمام عاملین

پیداوار ہر سال باقاعدگی کے ساتھ زکوٰۃ نکالیں تو سالانہ کتنی خطیر رقم سرمایہ داروں کی جیب سے نکل کر غریبوں اور ناداروں کے پاس پہنچتی ہے۔ اور اس طرح تقسیم دولت کی ناہمواری کتنی تیزی سے رفع ہو سکتی ہے۔

۲۔عشر | "عشر" درحقیقت زمینی پیداوار کی "زکوٰۃ" ہے۔ لیکن چونکہ اس پیداوار میں انسانی محنت کا دخل نسبتہً کم ہوتا ہے۔ اس لئے اسکی شرح ۵ ر ۲ فی صد کی بجائے ۱۰ فیصد رکھی گئی ہے۔ "عشر" صرف ان زمینوں کی پیداوار پر واجب ہوتا ہے۔ جو فقہی تفصیلات کے مطابق عشری ہوں اور اسکو زکوٰۃ ہی کے مصارف پر خرچ کیا جاتا ہے۔

۳۔کفارات | غریبوں تک دولت پہنچانے کا ایک مستقل راستہ اسلام نے کفارات کے ذریعہ مقرر کیا ہے۔ کوئی شخص بلا عذر رمضان کا روزہ توڑ دے۔ یا کسی مسلمان کو قتل کر دے یا اپنی بیوی سے ظہار کرنے یا قسم کھا کر اسے توڑ دے تو بعض صورتوں میں لازمی اور بعض صورتوں میں اختیاری طور پر اسے حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال کا کچھ حصہ ناداروں پر خرچ کرے۔ یہ نقد روپیہ کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے اور کھانے کپڑے کی صورت میں بھی۔

۴۔صدقۃ الفطر | اس کے علاوہ جو لوگ صاحب نصاب ہوں، ان کے لئے عیدالفطر کے موقعہ پر لازم کیا گیا ہے کہ نماز عید کو جانے سے پہلے فی کس پونے دو سیر گندم یا اسکی قیمت مفلسوں، ناداروں، یتیموں اور بیواؤں پر خرچ کریں۔ یہ رقم نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے بھی نکالی جاتی ہے۔ اور اس کے وجوب کے لئے مقدار نصاب کا "نامی" ہونا یا اس پر پورا سال گزرنا بھی ضروری نہیں ہے۔ لہذا اس طریقے سے ایک اجتماعی صورت کے موقع پر زیادہ سے زیادہ مساوات پیدا کی جا سکتی ہے۔

مذکورہ بالا چار مدات غریبوں اور مفلسوں میں دولت تقسیم کرنے کے لئے تھے۔ اس کے علاوہ دو مد وہ ہیں جن سے اعزہ و اقرباء کی امداد اور ان تک دولت کا پہنچانا مقصود ہے ان میں سے ایک مد نفقات کا ہے اور دوسرا وراثت کا۔

۵۔ نفقات | اسلام نے ہر انسان پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ اپنے خاص خاص رشتے داروں کی معاشی کفالت کرے۔ پھر ان میں سے بعض تو وہ ہیں جن کی کفالت بہر صورت واجب ہے۔ خواہ انسان تنگدست ہو یا خوشحال۔ مثلاً بیوی، نابالغ اولاد اور بعض وہ ہیں جن کی کفالت کی ذمہ داری وسعت کے ساتھ مشروط ہے۔ ایسے رشتے داروں کی ایک طویل

فہرست اسلامی فقہ میں موجود ہے۔ اور اس کے ذریعہ خاندان کے اپاہج کمزور افراد کی معاشی کفالت کا بڑا اچھا نظام بنایا گیا ہے۔

۶۔ وراثت | اسلام کا نظامِ وراثت اس کے نظریۂ تقسیمِ دولت میں ایک بنیادی امتیاز رکھتا ہے۔ وراثت کی مرتکز تقسیم سے تقسیمِ دولت میں جو ناہمواری پیدا ہوتی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ مغربی ممالک میں اس ناہمواری کا ایک بہت بڑا سبب یہی ہے۔ جسکا اقرار بہت سے ماہرینِ معاشیات نے کیا ہے۔

یورپ میں بالعموم اکبرالاولاد کی جانشینی کا طریقہ رائج ہے، جس میں سارا ترکہ بڑے لڑکے کو مل جاتا ہے۔ باقی سب محروم ہو جاتے ہیں۔ پھر بعض مقامات پر اگر مرنے والا چاہے تو کسی دوسرے شخص کے نام اپنے سارے ترکہ کی وصیت کر سکتا ہے۔ اور اس میں اسے مذکر اولاد کو بھی محروم کرنے کا حق ہے۔ اس طریقے کے نتیجہ میں دولت پھیلنے کے بجائے سمٹتی ہے۔ اس کے برعکس ہندو مذہب میں تقسیمِ دولت کو مردوں میں اشتراکی حد تک مساوی کر دیا گیا ہے۔ لیکن عورتیں بہرحال وراثت سے محروم رکھی گئی ہیں، جس سے ان پر ظلم ہونے کے علاوہ گردشِ دولت کا دائرہ اسلام کی بہ نسبت سمٹ جاتا ہے۔

اس کے برخلاف اسلام نے تقسیمِ وراثت کا جو نظام بنایا ہے، اس میں ان تمام خرابیوں کا انسداد ہو جاتا ہے۔ اس نظام کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ قرابت کے لحاظ سے وارثوں کی ایک طویل فہرست رکھی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے متروکہ دولت زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلتی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ دولت کے وسیع پھیلاؤ کے پیشِ نظر یہ حکم دیا جا سکتا تھا کہ سارا ترکہ غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے یا بیت المال میں داخل کر دیا جائے۔ لیکن اس صورت میں ہر مرنے والا کوشش کرتا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں سارا مال ختم کر جائے اور اس سے معیشت کے نظام میں ابتری پیدا ہو جاتی۔ اس لئے اسلام نے اسے میت کے رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کا نظام بنایا ہے۔

۲۔ دنیا کے تمام نظام ہائے وراثت کے برخلاف عورتوں کو بھی میراث کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

للرجال نصیب مما ترك الوالدان	عورتوں کیلئے (بھی) ایک حصہ ہے اس مال میں
والاقربون وللنساء نصیب مما ترك	جو والدین اور اقرباء چھوڑ کر جائیں اور عورتوں

الوالدان والاقربون مما قل منه	کیلئے بھی ایک حصّہ ہے اس مال میں جو والدین
او کثر نصیبا مفروضا ۔	اور اقارب چھوڑ کر جائیں ۔ تھوڑے میں سے
(النساء)	بھی اور زیادہ میں سے بھی ایک معین حصّہ ہے ۔

۳۔ مرنے والے کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ کسی وارث کو محروم کر دے یا کسی کے حصّہ میں ترمیم کر سکے ۔ اس طرح وراثت کے راستے سے ارتکازِ دولت کا امکان ختم کر دیا گیا ہے ـــــ ارشاد ہے :

آباؤکم وابناؤکم لا تدرون ایھم	تمہارے باپ بیٹوں میں کون نفع کے اعتبار
اقرب لکم نفعاً فریضۃ من اللہ	سے تم سے قریب تر ہے ۔ تم نہیں جانتے
....	یہ اللہ کا مقرر کیا ہوا قانون ہے ۔

۴۔ چھوٹی اور بڑی اولاد میں کوئی تفریق نہیں کی گئی بلکہ سب کو برابر حصّہ دیا گیا ۔

۵۔ کسی وارث کے لیے اس کے حصہ رسدی کے علاوہ کسی مال کی وصیت کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے ۔ اس طرح کوئی وارث متوفی کے مال سے اپنے حصّہ وراثت کے سوا کچھ نہیں پا سکتا ۔

۶۔ متوفی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ وارثوں کے سوا دوسرے لوگوں کیلئے وصیت کر جائیں اس سے بھی دولت کے پھیلاؤ میں مدد ملتی ہے ۔ اور تقسیمِ وراثت سے قبل دولت کا ایک حصّہ وصیّت پر صرف ہو جاتا ہے ۔

۷۔ لیکن وصیت کرنیوالے کو اس بات کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ پورے مال کی وصیّت کر جائے ۔ بلکہ اسے اپنے مال کے صرف ایک تہائی حصّہ میں ایسا کرنے کی اجازت دی گئی ہے ۔ اس سے زیادہ کی وصیّت کا وہ مجاز نہیں اس طرح ارتکازِ دولت کے اس خطرے کا سدِ باب کر دیا گیا ہے ، جو پورے مال کی وصیّت کی اجازت کی صورت میں پیدا ہو سکتا تھا ۔

خراج وجزیہ | مذکورہ بالا مدات کے علاوہ دو مد ایسے ہیں جن میں مالکان دولت کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے ، کہ وہ اپنی دولت کا کچھ حصّہ حکومتِ وقت کو ادا کریں ۔ ایک خراج اور دوسرا جزیہ ـــــ

خراج ایک قسم کا زمینی لگان ہے جو صرف ان زمینوں پر عائد کیا جاتا ہے جو فقہی تفصیلات کے مطابق خراجی ہوں اور اسکو حکومت اجتماعی کاموں میں صرف کر سکتی ہے ۔ اور یہ ایک تو ان غیر مسلم افراد سے وصول کیا جاتا ہے ۔ جو اسلامی حکومت کے باشندے ہوں اور حکومت نے ان کے جان مال

اور آبرو کی حفاظت کا ذمہ لیا ہو۔ دوسرے ان غیر مسلم ممالک سے بھی جزیہ وصول کیا جا سکتا ہے جن سے خرید کی ادائیگی پر صلح ہوئی ہو۔ یہ رقم بھی حکومت کے اجتماعی مقاصد میں صرف ہوتی ہے۔

اوپر تقسیم دولت کے جو ثانوی مدات بیان کئے گئے ہیں یہ سب وہ ہیں جن میں دولت صرف کرنا دولت کے اولین مالکوں کے ذمے شخصی طور پر واجب قرار دیا گیا ہے۔ غرباء و مساکین پر اور مسلمانوں کے اجتماعی مقاصد میں خرچ کرنے کی جو ترغیبات قرآن و سنت میں وارد ہوئی ہیں، وہ ان کے علاوہ ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

یسئلونك ماذا ینفقون — لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں

قل العفو۔ — آپ فرما دیجئے کہ جو بچ رہے۔

اس ارشاد نے واضح فرما دیا ہے کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ انسان صرف مقدار واجب خرچ کرنے پر اکتفاء نہ کرے۔ بلکہ جسقدر دولت اس کی ضرورت سے زائد ہو، وہ سب معاشرے کے ان افراد تک پہنچانے کو اپنی سعادت سمجھے جو دولت سے محروم ہیں۔

قرآن کریم اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "انفاق فی سبیل اللہ" کے احکام و فضائل سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان احکام کے ذریعہ اسلام نے تقسیم دولت کا جو خوشگوار نظام قائم فرمایا ہے اس کے نتیجے میں ہماری تاریخ کے اندر ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ معاشرے میں صدقات کو قبول کرنے والا ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا تھا۔

یہ اسلامی نظام تقسیم دولت کے چند نمایاں خد و خال تھے۔ اس مختصر مقالے میں اس نظام کی اتنی ہی جھلک دکھائی جا سکتی تھی۔ لیکن امید ہے کہ ان گذارشات سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ اس معاملے میں اسلامی نظام معیشت سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے کسطرح ممتاز ہے۔ اور اسکی بنیادی خصوصیات کیا ہیں ــــ۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

مسئلہ خلافت و شہادت

شہادت حضرت حسینؓ، مسئلہ خلافت اور مقام صحابہؓ پر حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ کی ایک بلند پایہ تقریر جو بیش قیمت اضافوں اور ترتیب و نظر ثانی کے بعد شائع کی گئی ہے۔ صفحات ۱۰۲ - ایک روپیہ کے ٹکٹ بھیج کر طلب فرمادیں۔ ایک کتاب وی پی نہیں کی جائے گی۔ شعبۂ نشر و اشاعت دارالعلوم حقانیہ۔ اکوڑہ خٹک